بات کل کی ہے اور محسوس ہوتا ہے یوں جیسے بچھڑے ہوئے اک زمانہ ہوا

حافظ یوسف سراج

ابوصخر حافظ عبدالمجید جام شہادت نوش کر گئے

گلاب کملا کیوں جاتے ہیں' سبز پتے مرجھا کیوں جاتے ہیں' پھول ہمیشہ ہی کھلا کیوں نہیں رہتا اور یہ انسان ۔۔۔۔ اسے کیا ہوتا ہے کہ جب یہ اپنا سارا وقار بھلا بیٹھتا ہے' جب یہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا ہوتا ہے' ایسا کیوں ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ اس کی فطرت ہے ہاں بالکل ٹھیک کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ کائنات کے سب سے بڑے' باہمت' حوصلہ مند اور صابر انسان حضرت محمد کریم علیہ السلام اپنے نرم و گداز ہاتھوں پہ اپنے پھول ایسے لخت جگر کو موت کی ہچکیاں لیتے ہوئے بے بسی سے دیکھ رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ جب یہی کریم نبی منصب نبوت کو ادا کر چکے تو عرش والے کا بلاوا آگیا۔ اب یہ ریشم سے بھی نازک بدن بے حس و حرکت پڑا ہے۔ یاقوتی ہونٹ بند ہیں' حرکت نہیں کرتے۔ شفیق سرمئی آنکھیں دیکھتی ہیں پر پہچاننے کی قوت جواب دے گئی۔ طائف کی وادیوں میں بہنے والا لہو ساکت ہو چکا۔ حرم کعبہ کی طرف جانے والے قدم ساتھ دینے سے قاصر ہیں اور صحابہ کرامؓ کی آنکھوں سے بہنے والا پانی رم جھم برستی بارش کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ صدیقؓ بھی رو رہا ہے عثمانؓ بھی' علیؓ بھی بلک رہا ہے اور طلحہؓ بھی' عمرؓ نے تو نیام سے تلوار نکال لی' فرط غم میں یوں ڈوب گئے کہ پکار اٹھے آج جس نے کہا کہ

> **پہاڑ کی ننگی پیٹھ پر کپڑ کی چاردیوار اور کپڑ کے ہی بنے ہوئے دو کمرے جن میں سے ایک باورچی خانہ کا درجہ رکھتا اور دوسرا بقول انکے ڈرائینگ روم بھی تھا' سلیپنگ روم بھی' بیڈ روم بھی تھا اور گیسٹ روم بھی' لائبریری بھی تھا اور اسٹڈی روم بھی**

محمد ﷺ وفات پا گئے تو اس کا سر تن سے جدا کر دوں گا۔ صدیقؓ نے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا' حوصلہ دیا اور سمجھایا کہ ایسا ہو چکا' پھر میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف دیکھتا ہوں تو سنائی دیتا ہے کہ جو کوہِ گراں ہم پر گر پڑا' جس دریائے غم میں ہم غرقاب ہوئے' اس کو اگر دنوں پر لاد دیا جاتا تو وہ اس کے بوجھ سے راتوں میں تبدیل ہو جاتے' ان کا نور زائل ہو جاتا۔ ہاں یہ شدت غم بھلا واقعی انسان ہی سہہ سکتا ہے۔ یہ انسان کا وجود نازک ہی ان زلزلوں کی زد میں کپکپا سکتا ہے۔ یہ غم' یہ الم' یہ حزن اور اس کی کیفیتیں کسی اور مخلوق کے بس میں کہاں۔ سعد بن معاذؓ چل بسے تو عرش الٰہی ہل کر رہ گیا' تاب نہ لا سکا' یہ تو ہم تم ہیں جو اگرچہ پتھر تو نہیں پر پتھر برداشت کر جاتے ہیں' جو فولاد تو نہیں' فولاد کی طرح ڈٹ جاتے ہیں' مگر آنسو رکتے کب ہیں یہ تو بہتے چلے جاتے ہیں۔

آنسوؤں کی برسات کا منظر میں نے **ابوصخر** کے جنازے پہ دیکھا وہ ابوصخر کہ جس کی ڈیڈ باڈی کو میں مردہ نہ مان سکا' جس کو میں ابوصخر ہی کہتا ہوں اور کہتا رہوں گا' ہاں وہاں کتنے ہی رونے والے تھے وہ بھی ذی علم تھے' عمل کے پہاڑ تھے' تقویٰ کے پیکر تھے' وہ سب رو رہے تھے' سب کی داڑھیاں بھیگے ریشم کی طرح تر تھیں' وہ اس لئے رو رہے تھے کہ جانے والے کے فراق میں ان کے سینے شق ہو گئے' جگر پھٹ گئے' بصارتیں ماند ہو گئیں' سینوں پہ طوفان کروٹیں لینے لگا' وہ سب یوں رو رہے تھے کہ آسماں بھی رو دیا ہو گا' فرشتے بھی اس غم پہ بلبلا

اٹھے ہوں گے ' رونے والوں میں متانت و وقار کے پیکر اس کے والد گرامی بھی تھے کہ جانے والے نے کبھی واپس نہ آنے والے سفر پر روانگی سے قبل اس کو اسلام آباد بلا لیا' اکٹھے کھانا کھایا اور پھر چل دیا' بوڑھے باپ نے کہا بیٹا آؤ گھر کو چلتے ہیں۔ کہنے لگا اباجان اب عید پہ آؤں گا ہاں وہ کب جانتا تھا کہ اب کبھی بھی کسی عید پہ نہ آسکے گا اور اب تو ہم ہی اس کے پاس جائیں گے۔ غم سے نڈھال مگر صبر کے دامن سے بندھے باپ نے کہا مجھے علم ہوتا تو میں اور مل لیتا اگر وہ اور مل لیتے تو پھر کیا ہوتا؟ شاید حسرت کچھ کم ہو جاتی' میں نے اس کے چچا کو کرب کی عجیب کیفیتوں سے گزرتے دیکھا کہ جب وہ لرزتی اور کرب سے تڑپتی آواز میں کہہ رہا تھا "یہاں اس کے جہاد والے ساتھی بھی موجود ہیں اگر کسی کو اس سے تکلیف پہنچی ہو تو خدا کیلئے معاف کر دے" اور یہ چند الفاظ کہنے کیلئے اس کی سانس نے کتنی بار ساتھ چھوڑا' لہجہ کتنی بار تڑپا' یہ تو سننے والے ہی جانتے ہیں اور میں نے اس کے چھ توانا اور مضبوط جسم رکھنے والے بھائیوں کو یوں تڑپتے دیکھا کہ جس طرح سوکھی ٹہنی آندھیوں کی زد میں آئی ہو۔ کتنے ہی خوبصورت چہرے تھے جن پر فصل غم اگ آئی تھی' کتنے ہی سینے تھے جہاں دریائے غم ابل پڑنے کو تیار تھا۔ وہاں اس کے مجاہد ساتھی تھے جو اشکوں کو اپنی پلکوں کے حصار میں مقید کئے چپ چاپ تجہیز و تکفین کے مراحل میں مصروف تھے۔

اور وہ جو میر لشکر تھا' جس نے اس مجاہد کو جان کی بازی ہارتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا' جو اس کا شب و روز کا رفیق تھا' پہنچا تو بے اختیار بلک پڑا۔ ایک بزرگ ہاتھ اس کے کندھے کی طرف سرک گیا کہ خاموش اگر آج تم بھی رو پڑے تو خاموش کون رہے گا؟ موت کتنی بڑی حقیقت ہے' یہ کس قدر تلخ ہے' یہ کرب کی کون سی مئے ناب ہے۔ کاش کوئی یہاں

> **مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اب تمام کسریں نکال دی ہونگی۔ اس نے فرشتوں سے کہا ہوگا' دیکھو یہ میرا بندہ اپنی زندگی میرے راستے میں لگاتا رہا۔ میں نے جب بھی زخم دیا' یہ مسکراتا رہا' اس نے گھر نہیں بنایا تھا تو اب اس کو ایسا گھر دے دو کہ جو دنیا والوں کے گمان میں بھی نہ ہو**

آ کے دیکھتا تو پھر دنیا کا حقیر ہونا اسے سمجھ میں آتا' غمزدہ دل ماتم گسار تھے اس لئے کہ یہ رو ہی تو سکتے تھے ہاں کہ وقت معین سے پہلے تو مر بھی نہیں سکتے' زندہ رہنا پڑتا ہے۔ یہ الگ بات کہ جینے کے انداز بدل جاتے ہیں۔

کسی محسن کی جدائی میں کبھی کوئی مرا تو نہیں
ہاں مگر جینے کے انداز بدل جاتے ہیں!

آیئے! ذرا اچٹتی سے نگاہ ڈالتے

چلیں کہ یہ مرنے والا کون تھا؟

مولانا شرف الدین دہلوی سے کسب فیض کرنے والے اور فتاوٰی علمائے اہلحدیث مدون کر کے نام کمانے والے مولانا علی محمد سعیدی صاحب کے شاگرد مولانا حافظ عبدالستار صاحب کے ہاں اس پھول نے 7/8AR میانچنوں میں جنم لیا۔ والدین نے اس کا نام عبدالمجید رکھا اور معروف دینی سکالر حافظ عبدالرشید اظہر صاحب ان کے چچا ہیں۔ بچپن میں علم و تقویٰ کا ماحول ملا اور قرآن مقدس کی روحانی غذا ان کو میسر آئی۔ جلد ہی قرآن کے پرنور الفاظ کو اپنے سینے پر منتقل کر لیا۔ حفظ قرآن کے بعد دینی و عصری علوم کی مقدس دانش گاہ جامعہ سلفیہ میں ان کو علوم دینیہ سے بہرہ مند ہونے کیلئے داخل کروا دیا گیا۔

یہاں انہوں نے دلجمعی سے فرامین محمد مصطفیٰ ﷺ اور اللہ وحدہ لاشریک کی لازوال کتاب کی تفہیم کیساتھ ساتھ معاون علوم میں بھی دسترس حاصل کرنا شروع کر دی۔ ابھی اس سلسلہ میں چند ہی سال صرف ہوئے تھے کہ ہمسایہ ملک افغانستان میں جنگ کی بھٹی تپ اٹھی ۔ روس اپنی طاقت کے نشے میں چور بدمست ہاتھی کی طرح افغانیوں پہ جھپٹ پڑا۔ افغانی اپنی غیرت ایمانی کے بل پہ اٹھے اور اس اندھے ہاتھی کی روک تھام اور شکست و ریخت کیلئے متاعِ قلیل لے کر میدان میں نکل کھڑے ہوئے اور یہ وہی وقت تھا جب افغانی ڈنڈوں اور پتھروں سے جہاد کر رہے تھے۔ روس جو میدانی علاقے کا کھلاڑی تھا پہاڑی علاقے میں اس بری طرح پھنسا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ پہاڑی راستوں سے جب ان کے ٹینک گزرتے تو افغانی چند چھوٹے چھوٹے پتھر کپڑے میں باندھے' گٹھڑی سی بنائے ان کی گھات میں پہلے سے موجود ہوتے جونہی ٹینکوں کے اس ریوڑ کا سرخیل "کیموفلاج" افغانی کے پاس سے گزرتا وہ فوراً گٹھڑی ٹینک کے چین میں پھنسا دیتا۔ ٹینک چلنے سے انکار کر دیتا تو ڈرائیور جانچ پڑتال کرنے کیلئے سر باہر نکالتا۔ یہی وہ موقع ہوتا تھا جب افغانی کی کلہاڑی بڑی سرعت سے گھومتی اور روسی جہنم رسید کر دیا جاتا۔ اگلا ٹینک پھنس جانے کی وجہ سے پچھلے تمام دیوہیکل لوہے کے

ٹینک بے بس کاغذ کے پرزوں کی طرح ساکت کھڑے رہتے۔

انہی دنوں جب دنیا کے کونے کونے سے غیرت مند نوجوان اپنے لہو کا نذرانہ لئے سرزمین افغانستان کے مقتل گاہ میں جانیں پیش کر رہے تھے جامعہ سلفیہ کے اکابرین نے بھی امت کے اس درد کو محسوس کیا اور جہاد میں عملی شرکت کا پروگرام بنایا۔ یوں پہلا جہادی قافلہ مولانا حافظ عبدالستار حماد اور مولانا داؤد مدنی فہیم (مرحوم) کے سنگ افغانستان کے سنگلاخ پہاڑوں پہ جا اترا۔ اس اولین قافلے میں یہ نوجوان جو تب ایک طالب علم تھا بصد کوشش شامل ہو گیا۔ تب یہ صرف حافظ عبدالمجید تھا اب افغانستان میں آتش و آہن کی برستی برکھا میں تربیت ہوئی وہیں اللہ کی اترتی مدد کے نظارے دیکھے تو تربیت کے بعد واپس پلٹنا گوارا نہ کیا۔ اللہ کے راستے میں گرم خون بہانے کا یہ جذبہ تھا کہ اس نوخیزی میں افغان بھائیوں کی ہمرکابی میں معرکوں میں شرکت شروع کر دی۔ جب تک افغانستان میں معرکہ کارزار جاری رہا یہ نوجوان بھی شہادت کی تمنا دل میں بسائے برسرپیکار رہا۔ جب اپنے ہاتھوں سے کتنے ہی روسی مردار کر چکا تو ادھر ہندو بنیے کے ہاتھوں ذبح ہوتے کشمیریوں کی مدد کیلئے اسے طلب کر لیا گیا۔ چونکہ معرکوں میں عملی طور پر حصہ لے چکا تھا' آتش و بارود میں پائیہ استقلال دکھلا چکا تھا۔ سو نوآموز ساتھیوں کو جہادی تربیت دینے پر مامور کر دیا گیا۔ اپنا کام انتہائی تندہی اور مہارت سے انجام دیتا رہا۔

میدان جنگ کی سختی' بارود کی بو' خون کا بہنا' عموماً جہاد میں مشغول ساتھیوں پہ اپنا ایک الگ ہی رنگ جما دیتا ہے اور بعض میں اس سے شدت اور سختی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر یہ اپنی خوب روئی کیساتھ ساتھ چونکہ خوب سیرتی بھی ملحوظ رکھے ہوئے تھا۔ اس لئے لہجے کی تازگی اور زبان کی شگفتگی کو مرنے نہ دیا۔ بلکہ اس میں جہادی مزاج نے کچھ اور ہی نکھار پیدا کر دیا۔ اگرچہ لہجے میں کچھ تحکمانہ رنگ پایا جاتا تھا مگر ایسا جو مخاطب کو ادر ناگوار نہیں گزرتا تھا بلکہ بھلا ہی محسوس ہوتا تھا سر در خشتا تھا' بات کو زیادہ پھیلا کر کرنے کا عادی نہ تھا' دوٹوک اور مختصر بات کرتا مگر بڑی واضح اور مفہوم کے اعتبار سے پائیدار گفتگو ہوتی۔

مجھے امید ہے اے بھائی کہ تو بڑے عیش و تنعم میں ہو گا' حوروں کے جھرمٹ میں تیرے قہقہے گونجتے ہوں گے' ابریشم کے نرم کپڑے تو نے زیب تن کئے ہوں گے' موتیے کی خوشبو میں بسے گالوں میں تیری نظریں دیکھتی ہوں گی۔ مگر ہمارے قلب پہ جو بیت گئی کاش تو وہ بھی جان سکتا۔

میدان قتال سے وابستہ رہنے کے باوجود مطالعہ انتہائی پابندی سے کرتا' کتب بینی کا شوق بڑے جذبے سے اس میں موجود تھا۔ ہر نئی آنے والی اچھی کتاب کو ضرور خرید لیتے' پڑھتے اور پڑھنے کے بعد آبائی گاؤں میں اسلامی دارالمطالعہ کے نام سے قائم کردہ لائبریری میں استفادہ عام کیلئے رکھ دیتے۔ اس کے ساتھ ساتھ اخبارات و جرائد پہ نظر رکھتے' کالموں کا مطالعہ فرماتے' عربی جرائد کا بھی ممکن حد تک مطالعہ کر لیتے اور اچھی حاصل ہونے والی چیزیں دوسروں کے سامنے بیان کرتے۔

جہادی کام ذرا اور بڑھا تو ان کو لانچنگ کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ مقبوضہ کشمیر میں چپے چپے کے حالات سے آگاہی حاصل کرنا' مجاہد ساتھیوں کی تازہ کھیپ مختلف علاقوں میں بھیجتے رہنا۔ سامان رصد کو مجاہدین کی کمین گاہوں تک پہنچانا اور دیگر متعلقہ کام کافی عرصہ تک خوش اسلوبی سرانجام دیتے رہے۔

اس عرصے میں جہاد میں بالفعل شرکت ہمیشہ سے ان کی اولین خواہش رہی۔ اندر وادی میں ہندو کے دوبدو لڑنے کی حسرت اکثر امیر کے سامنے پیش کرتے مگر اجازت نہ ملتی۔ تسکین قلب کی خاطر بارڈر ایکشن میں حصہ لیتے یعنی بارڈر کے قریب علاقوں میں شب خون مارتے اور واپس چلے آتے۔

جان کو اللہ کے راستے میں یوں لگا دیا تھا کہ اس کی ذرہ برابر پرواہ نہ کرتے۔ ہم اس وقت قرآن کریم حفظ کر رہے تھے۔ چیچہ وطنی کے قریب مدرسہ تحفیظ القرآن والحدیث داد فتیانہ میں وہاں سے ان کا جب بھی گزر ہوتا۔ نماز کیلئے رک جاتے اور یوں ہمیں اس مرد مجاہد سے شرف بازیابی کا موقع ملتا۔ وہ ایسا ہی ایک موقع تھا کہ ابو صخر بھائی وہاں سے گزرے حسب معمول رک گئے۔ ہم سے ملے' باتیں ہو رہی تھیں کہ شلوار کا پائنچہ ذرا سا کھسکا' تو ہم نے دیکھا کہ گلاب کے پھول جتنا زخم چمک رہا ہے' تازہ زخم تھا اور گہرا گھاؤ۔ ہم نہایت دہشت زدہ ہوئے' پوچھنے پر بتلایا کہ بارڈر ایکشن میں گولیاں لگی تھیں' ہم حیرت سے اسے تک رہے تھے کہ جو ٹانگ میں گولیاں کھائے اور اتنا بڑا زخم سجائے اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ جب پوچھا کہ ڈریسنگ

نہیں کروائی تو کہنے لگے مجاہدوں کے زخم اللہ شہد سے ہی ٹھیک کر دیتا ہے میں بھی شہد ہی لگایا کرتا ہوں۔

سادگی میں یوں تھے کہ عید کے روز نئے کپڑے نہ پہنتے۔ پہلے سے زیر استعمال صاف ستھرے کپڑے زیب تن کرتے تو اللہ ایسا وقار عطا کرتے کہ جو نئے جوڑوں میں ملبوس لوگوں میں بھی مفقود ہوتا۔ گاؤں میں ہی ان کی شادی اس سادگی سے ہوئی کہ قرون اولیٰ کے مناظر یاد آ گئے، نہ زیادہ لوگ بلوائے، نہ بھاجی، نہ اژدہام، بس چند مجاہد تھے جو ساتھ ہی لائے تھے، انتہائی سادگی سے مسجد میں نکاح ہوا، خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے گئے اور چند افراد پر مشتمل بارات واپس پلٹ آئی۔ چند ہی دنوں کے بعد یہ مرد مجاہد دوبارہ راہ جہاد میں نکل کھڑا ہوا۔

گرمیوں میں مجھے مظفر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہیں ملاقات ہوئی کچھ روز میں وہاں ٹھہرا۔ ایک دن فرمانے لگے کہ کھانا ہمارے ساتھ کھائیے گا۔ وقت مقررہ پر ساتھ لئے جا رہے تھے۔ پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے رک کے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولے کہ میں نے سوچا چلو آپ بھی ہمارا دولت خانہ دیکھ لیں۔ ان کی اس بات نے مجھے انتہائی حیرت زدہ کر دیا کہ کوئی کتنا ہی بلند و بالا محل کا مالک کیوں نہ ہو۔ اپنے منہ سے دولت خانہ نہیں کہتے سنا۔۔۔ انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں میں پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا کہ کپڑے کی ایک دیوار سی تھی جس کے پاس وہ رک گئے۔ ذرا بلند آواز سے کھنکھارے یوں جیسے پردہ کے پیچھے کسی کو متنبہ کر رہے ہوں۔ چند لمحوں بعد ہمیں لئے اندر داخل ہو گئے۔ یہ ہے جی ہمارا دولت خانہ وہ بولے اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پہاڑ کی ننگی پیٹھ پر کپڑے کی چار دیواری اور کپڑے کے ہی بنے ہوئے دو کمرے جن میں سے ایک باورچی خانہ کا درجہ رکھتا تھا اور دوسرا بقول انکے ڈرائنگ روم بھی تھا، سلیپنگ روم بھی، گیسٹ روم بھی، بیڈ روم بھی، لائبریری بھی تھا اور سٹڈی روم بھی۔

حالت یوں تھی کہ کوئی تین تین فٹ تک ایک اینٹ کی دیوار تھی، اوپر موٹے کپڑے کی دیوار اور لکڑی کی چھت۔ ایک کونے میں لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر انہیں پلنگ کی شکل دے رکھی تھی۔ قریب ہی ایک ریک میں کتابیں نظر آ رہی تھیں۔ ادھر دوسرے کونے میں ٹونٹی دکھائی پڑ رہی تھی اور ساتھ ہی ہاتھ کا دھولنہ۔ واہ رے اللہ تیری شان تو گویا یہ تھا امیر بیت المجاہدین کا دولت خانہ اور چہرے سے ٹپکتی اطمینان کی دبیز لہر۔۔۔ ایسی تو شاید وائٹ ہاؤس رہنے والوں کو بھی نصیب نہ ہوئی ہو گی۔ اس سادہ سے گھر میں مجھے جو چیز بھی نظر آئی اس میں ایک قرینہ اور سلیقہ تھا۔ ترتیب تھی جو چیخ چیخ کر اپنے مکین کی نفاست اور عمدہ ذوق پہ دلالت کر رہی تھی۔ میں نے حیرت ظاہر کی تو کہنے لگے والد صاحب ادھر آئے تو وہ بھی حیران ہوئے تھے۔ میں نے انہیں بھی کہا تھا کہ آدمی کو اتنی ہی پرواز کرنی چاہئے کہ گرے تو چوٹ نہ آئے۔ ہم جہاں رہ رہے ہیں اگر عہدوں سے معزول بھی کر دیا جاؤں تو اسی پوزیشن میں رہ لینے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہو گی۔ واہ اے بھائی! شاید تو نے اپنے سفر کی بہت پہلے ہی تیاری شروع کر رکھی تھی کہ "کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل" پہ تو عمل پیرا تھا تو نے اس دنیا کیلئے کچھ بنایا ہی نہیں اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اب تمام کسریں نکال دی ہوں گی۔ اس نے فرشتوں سے کہا ہو گا۔ دیکھو یہ میرا بندہ اپنی زندگی میرے راستے میں لگاتا رہا۔ میں نے جب بھی زخم دیا، یہ مسکراتا رہا، اس نے گھر نہیں بنایا تھا تو اب اس کو ایسا گھر دے دو کہ جو دنیا والوں کے گمان میں بھی نہ ہو اور مجھے امید ہے اے بھائی کہ تو بڑے عیش و تنعم میں ہو گا، حوروں کے جھرمٹ میں تیرے قہقہے گونجتے ہوں گے، ابریشم کے نرم کپڑے تو نے زیب تن کئے ہونگے، موتیے کی خوشبو میں بسے گلابوں میں تیری نظریں دیکھتی ہوں گی۔ مگر ہمارے قلب پہ جو بیت گئی کاش تو وہ بھی جان سکتا۔ آہ کہ ۔

فضا میں رنگ ستاروں میں روشنی نہ رہی
تیرے بعد یہ بھی ممکن ہوا کہ زندگی نہ رہی
خیال خاطر احباب واہمہ ٹھہرے
اس انجمن میں کہیں رسم دوستی نہ رہی

اے میرے پیارے بھائی۔

آ دیکھ گریبان گل و لالہ کا انجام
کس جرم میں ملتی ہے بہاروں کو سزا دیکھ
اک بار تو ویرانیء منزل پہ نظر ڈال
اک بار تو یاران سبک گام کو آ دیکھ
ہر گام پہ ہے شعلہ فشاں سیل بلا دیکھ
جو ہم پہ گزرتی ہے اک بار تو دیکھ

ہاں! مگر ہم جانتے ہیں کہ تو نہیں آ سکتا۔ خود میں نے اپنے ہاتھوں سے تین بار مٹھیاں بھر بھر کے روتی آنکھوں تیری نظر کی ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے ہم نے تجھے نہلایا ہے لحد میں اتارا ہے۔ ہاں تو نہیں آئیگا کبھی نہیں، اس سے قبل جو گئے کوئی آیا ہے جو تو آئے گا۔ دیکھنا وہاں تیرے پاس کتنے لوگ ہوں گے، وہاں احسان بھی ہو گا، وہاں ہزاروں دلوں میں تڑپ پیدا کرنے والا شورش کاشمیری بھی ہو گا، وہاں خطیب ہند عطاء اللہ شاہ بخاری بھی ہو گا، ناموس رسالت پہ مر مٹنے والا غازی علم الدین شہید بھی ہو گا، سب ہوں گے اور انتظار کرنا دیکھتے رہنا اک دن ہم بھی تیرے پاس چلے آئیں گے۔

انشاءاللہ